



## آدھی صدی کا سفر

مکرم عرفان احمد خان صاحب۔ جرمنی

اس کے لئے پہلی کوشش پاسپورٹ بنوانا تھی جس کا بنانا دنوں اتنا آسان نہیں تھا۔ بلکہ صاف لفظوں میں اس زمانے میں شہری کا اپنے ملک کے پاسپورٹ کا حامل ہونا اس کا حق نہیں تھا۔ پاسپورٹ بنانے کے دفاتر بھی پورے ملک میں چند تھے۔ ربوہ کے شہریوں کو لاہور پاسپورٹ آفس سے رجوع کرنا ہوتا تھا۔ ربوہ میں ایک مقامی دفتر ایسا تھا جس کا پاسپورٹ آفس سے واسطہ رہتا اس لئے اگر ربوہ کے کسی شہری کو پاسپورٹ بنوانے کے ضرورت پیش آتی تو وہ اس مقامی دفتر سے مشورہ کر کے اس پر عمل پیرا ہوتا۔ مجھے اس دفتر میں موجود تجربہ کار نے بتایا کہ پاسپورٹ حکام آپ سے پہلا سوال یہ پوچھیں گے کہ آپ کس ملک اور وہاں کیوں جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ جرمنی سے کوئی دعوت نامہ منگوائیں۔ چنانچہ والد صاحب کی وساطت سے مکرم مسعود احمد صاحب جہلمی مبلغ جرمنی تک اپنا مدعا پہنچایا تو موصوف نے نہایت شفقت کا اظہار کرتے ہوئے ایک

نو عمری میں یہ کٹھن مراحل میں نے جن بزرگوں کی مدد سے عبور کئے ان کو آج آدھی صدی بعد یاد کرنے اور ڈہرانے کا مقصد ان کے لئے دل میں اٹھنے والے دعائیہ جذبات ہیں جن سے مغلوب ہو کر میں قارئین کو بھی ان بزرگوں کے بلندی درجات کے لئے دعا کی اس تحریک میں شامل کرنا چاہتا ہوں جو ان بزرگوں کے لئے میرے دل میں موجزن رہتی ہے۔

تعلیم الاسلام کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے میڈیکل اور پری میڈیکل کے طلبہ تو میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ کالجز میں چلے جاتے۔ آرٹس گروپ میں بی اے کرنے والوں کے لئے یا تو ایم اے عربی میں داخلہ لینے کی چوائس تھی یا دوسرے پھر وہ ان شہروں کا رخ کرتے جہاں مختلف مضامین میں ماسٹر زکرا نامکن تھا جس کے لئے خاصی رقم درکار ہوتی۔ جو چند مجھ جیسے نالائق باقی رہ جاتے ان کے لئے بزرگوارم حسن محمد خان عارف کا بیرونی برآمدہ

ماہ دسمبر کی 18 وہ تاریخ ہے جس کو میں چاہوں بھی تو اپنے دل و دماغ سے بھلا نہیں سکتا ہر سال جب جرمنی کے شدید سرد موسم میں یہ ایام آتے ہیں تو میں یاد ماضی کی ان گنت پگڈنڈیوں کا مسافر بن جاتا ہوں۔ اسی لئے 18 دسمبر کی میری زندگی میں خاص اہمیت ہے۔ جوانی میں قدم رکھتے وقت اپنے مستقبل کے حوالے سے ہر نوجوان کی طرح میرے دل میں بھی جن اُمنگوں اور خواہشات نے جنم لیا ان کا اپنے اس وقت کے حالات سے موازنہ کروں تو پشیمانی اور تعجب کے ساتھ حیرانی بھی ہوتی ہے۔ انسان کے لئے بعض فیصلے تقدیر نے کر رکھے ہوتے ہیں ان فیصلوں کی عملی صورت تک پہنچنے کے لئے ایک وقت مقرر ہے انسان کو حوصلہ، وسائل اور تگ و دو کے ساتھ مقررہ وقت کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ 18 دسمبر 1972ء کو میں علی الصبح اردن کی قومی ایئر لائن Royal Jordanian جس کا اس وقت نام عالیہ تھا کے طیارے پر کراچی سے سوار ہو کر عمان، جینیوا سے ہوتا ہوا اولین شب فرانکفرٹ ایئر پورٹ پر ایک نئے جہان میں اترا۔ پچاس سال پہلے اس روز میں اپنی زندگی کے جس سفر پر روانہ ہوا وہ خدا تعالیٰ کے فضلوں اور احسانات سے بھرپڑا ہے۔ محدود وسائل کے حامل والدین کی درد منداندہ دعائیں تھیں جو زندگی بھر میرا سہارا بنیں اور ہر منزل کو مجھ سے قریب تر کرتی چلی گئیں۔ پچاس سال پہلے ہوائی سفر اختیار کرنے سے زیادہ مشکل کام پاسپورٹ بنوانا تھا۔ حکومت نے سٹوم کی رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ جن مراحل سے گزرنا پڑتا تھا ان پر منیر نیازی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔



مکرم مسعود احمد جہلمی صاحب

فیکٹری کے لیٹر پیڈ پر اس کے لیبر افسر مٹر بارگل کا دستخط شدہ خط ارسال کر دیا۔ خط کا آنا تھا کہ میں خیالوں

خیالوں میں جرمنی جا پہنچا۔ ناسمجھ ذہن یہ نہیں جانتا تھا کہ ابتدائے عشق سے انتہائے عشق کا فاصلہ بڑا کٹھن ہے اور منزل کو پانے تک نہ جانے کتنے دریا بھی عبور کرنے ہیں۔ خط ملنے کے بعد مکرم حسن محمد خاں عارف صاحب کے اسی بیرونی برآمدہ میں ٹائپ رائٹرز کے درمیان بیٹھ کر پاسپورٹ فارم پر ہوئے۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو میں والدین اور حسن عارف صاحب

ایک کارآمد آماج گاہ تھا۔ جہاں انگریزوں کے زمانہ کے چند ٹائپ رائٹرز موجود تھے جن پر پریکٹس کرنے سے ہاتھوں کی انگلیاں



مکرم حسن محمد خان عارف صاحب

درد کرنے لگتیں۔ وہ برآمدہ جس نے بہت سارے نوجوانوں کی زندگیاں بنانے میں مدد فراہم کی میں وہاں بشکل ایک شام گزار سا۔

ان دنوں میرے ہم عمر فرید عارف صاحب کے جرمنی جانے کے لئے کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند بڑوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ مجھے بھی اسی کشتی کا سوار بنا دیا جائے۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

کی نصیحتوں کی جگالی کرتا عازم لاہور ہوا۔ حسن عارف صاحب بار بار کہتے بیٹو (وہ مجھے اسی نام سے پکارتے تھے) میری باتوں کو پلے باندھ لے۔ پاسپورٹ دفتر کی لائن میں لگنے سے پہلے کئی شکاری تجھے دبوچنا چاہیں گے۔ پاسپورٹ چند دن میں بنوا کر دینے کے وعدے کریں گے۔ پر شدہ فارم کسی شکاری کو نہیں دکھانا۔ اس میں کوئی غلطی نہیں۔ فارم وصول کرنے والی کھڑکی سے پہلے کسی کے سوال کا جواب نہیں دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لاہور پہنچ کر فارموں کو جمع کروانے سے قبل ان کو کسی سرکاری افسر سے تصدیق کروانا تھا۔ ان دنوں واپڈا ہاؤس میں محکمہ انکم ٹیکس کا دفتر ہوا کرتا تھا جہاں حضرت حافظ روشن علی صاحب کے نواسے مخدوم عثمان علی صاحب سی ایس پی افسر تھے۔ چند سال قبل جب وہ مسجد مبارک میں معتمد ہوئے تو ان کو کھانا پہنچانے



مکرم مخدوم عثمان علی صاحب

کی ذمہ داری میں نے نبھائی تھی۔ نہ خیال تعلق کی بناء پر کاغذات لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے

کمال شفقت سے یہ

کام کر کے جلد فارغ کر دیا۔ اللہ ان کو جزاء دے۔ ان دنوں پاسپورٹ آفس میں کام کا طریق یہ تھا کہ کھڑکی پر کاغذات کی جانچ پڑتال کی جاتی اور کاغذات درست ہونے کی صورت میں عمارت کی اندر داخلہ کی اجازت ملتی اور پاسپورٹ افسر کو انٹرویو دینا پڑتا۔ یہ اب صاحب کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ کاغذات جمع کر لے یا اعتراض لگا کر واپس کر دے۔ پاسپورٹ آفس کی ابتدائی کھڑکی سے زیادہ تر لوگوں کو اعتراض لگا کر واپس کیا جا رہا تھا۔ یہ منظر مجھ غریب کے لئے باعث پریشانی تھا۔ کھڑکی سے مایوس کئے جانے والوں کی طرف شکاری لپکتے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ بات ہی کوئی نہیں۔ ہم بنوا کر دیں گے پاسپورٹ۔ وہاں ہی بھاؤ ڈالے ہونا شروع ہو جاتے۔ یہ سب پاسپورٹ آفس کی ملی بھگت سے ہو رہا تھا۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے مکرم حسن عارف صاحب کو جنہوں نے مجھے پہلے سے اس سارے ماحول سے متعارف کروا کر خبردار کر

دیا تھا۔ میری باری آنے پر کاغذات دیکھ کر اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ متعلقہ افسر نے پھر کاغذات کا جائزہ لیا اور پوچھا کہ آپ جرمنی روڈ کے ذریعہ جائیں گے یا ہوائی جہاز سے۔ میرا جواب سن کر انہوں نے کہا کہ آپ کو سب ملکوں کے لئے کارآمد پاسپورٹ نہیں جاری کیا جائے گا بلکہ جرمنی تک کے سفر کے دوران درمیان میں آنے والے ممالک کے لئے کارآمد پاسپورٹ جاری ہوگا۔ حکومت کی نئی پالیسی کے تحت آپ کو ایک لاکھ روپے کی ضمانت کا انتظام کرنا ہوگا۔ ضمانت کے الفاظ انہوں نے فارم پر بھی لکھ دیئے اور دستخط کے ساتھ مہر بھی مثبت کر دی۔ پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں فارم واپس میرے ہاتھ میں تھا دیئے گئے۔

باہر نکل کر اب تک کی کارروائی خط کے ذریعہ والد محترم کو لکھ دی۔ اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ خاکسار کا قیام ماڈل ٹاؤن میں مکرم مبشر دہلوی صاحب کے ہاں تھا۔ اللہ ان کو اور ان کی اہلیہ کو جزا دے کہ جرمنی کے سفر کی تیاری کے مراحل کو آسان بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ والد صاحب کا جواب آنے پر میں چند ایک ایسے احباب سے ملا جن کا ذکر والد محترم نے کیا تھا۔ میں روز صبح ماڈل ٹاؤن



مکرم مبشر احمد دہلوی صاحب

بس سروس پر بیٹھ کر شہر آتا۔ دن بھر بھاگ دوڑ کرتا اور ہر شام ناکامی سے دوچار ہو کر شام گئے

پیدل واپس ماڈل ٹاؤن کی طرف چل پڑتا۔ ایک لاکھ روپے کی ضمانت کا حصول و بال جان بن گیا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا اور معاملہ سفر خرچ کے لئے ساتھ لائے دس روپے کی آخری ریزگاری تک آن پہنچا اور پیدل چلنے کی ہمت بھی جواب دینے لگی تو اپنے والد کے ایک دوست پاکستان ٹائمز کے چیف سپورٹس رپورٹر مکرم آصف خان صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر والد صاحب کے نام عرضی نامہ لکھا۔ پاکستان ٹائمز کا دفتر میوہسپتال کے عقب میں نیشنل پریس ٹرسٹ کی بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں سے لاہور ریلوے اسٹیشن

زیادہ دور نہیں۔ چنانچہ خط لے کر میں سرگودھا ایکسپریس کی روانگی کے وقت ربوہ جانے والے مسافر کی تلاش میں ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ مولوی بشیر احمد صاحب قادیانی کے بھائی مکرم مبارک احمد صاحب جوان دنوں جامعہ نصرت کے دفتری سٹاف غالباً اکاؤنٹس سے منسلک تھے ان کے حوالے یہ خط اس درخواست کے ساتھ کیا کہ آج ربوہ پہنچ کر گھر جانے سے قبل والد صاحب کو پہنچا دیں اور وہ کل صبح اسی گاڑی سے آنے والے کسی مسافر کے ہاتھ اس خط کا جواب تحریر کر دیں جو مجھے مسافروں سے ٹکٹ واپس جمع کرنے والے بابو کے پاس کھڑا پائے گا۔ چنانچہ اگلی صبح میں مقررہ جگہ پر اپنے نامہ بر کا منتظر تھا کہ مکرم مولانا ابولمنیر نورالحق صاحب باواز بلند السلام علیکم کہہ کر یوں بے تکلفی سے مخاطب ہوئے۔ تمہارے ابا تو کہہ رہے تھے سچے سچے کو تسلی دینا تم تو اچھے بھلے ہو۔ یہ لو اپنے ابا کے خط۔ مولانا کے انداز تکلم میں اس قدر پدرانہ شفقت اور اپنائیت تھی کہ ان سے مل کر میری ڈھارس بندھی۔ والد محترم نے دو



مکرم مولانا ابولمنیر نورالحق صاحب

خطوط بھجوائے تھے۔ میرے نام خط میں دعاؤں اور خداتعالیٰ پر کامل یقین اور توکل کی نصیحت کے بعد لکھا تھا کہ دوسرا خط اپنے

دوست مولانا محمد شفیع اشرف صاحب کے نام ہے وہ آج کل دہلی دروازے والی مسجد میں مرہبی سلسلہ ہیں۔ ان سے مل کر ایک آخری کوشش کر لو۔ اگر پھر بھی کامیابی نہ ہو تو واپس آ جاؤ پھر خدا جس حال میں رکھے اسی میں خوش رہنے کے ڈھنگ سیکھو۔ میں لاہور اسٹیشن سے سیدھا دہلی دروازے احمدیہ مسجد پہنچا۔ مولانا اشرف صاحب سے واقفیت تو تھی۔ بہت تپاک سے ملے۔ خط پڑھتے ہی اچکن پہنی اور مجھے ساتھ لے کر چل پڑے۔ مجھ سے منزل کا ذکر نہ کیا۔ میں خاموش پیچھے پیچھے چل پڑا۔ تھوڑی دور جا کر سواری والے تانگہ میں جا بیٹھے اور گنپت روڈ پر جا اترے۔